جرمنی میں اسلام

زیر نظر مضمون فرانس کے ممتاز اخبار روزنامہ "لی مونڈے" میں شائع ہوا تھا جو مصنف کے ذاتی خیالات کا عکاس ہے۔

گونٹر گراس نے حال ہی میں ایک کھلے خط میں مطالبہ کیا ہے کہ کولڈام میں مسجد تعمیر کی جائے۔ مصنف نے اپنے مطالبے کے حق میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اب کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کے بعد مسلمان، جرمنی کی تیسری بڑی جمعیت ہیں اس لئے برلن میں مسلمانوں کی عبادت کے لئے مسجد ہونی چاہیئے۔ مصنف نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے چونکہ یہ صورت حال برقرار رہے گی اس لئے مسلمانوں کے لئے عبادت گاہ ضروری ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کو سترہویں صدی کے اواخر میں فرانس کے ہیوگناٹس پروٹسٹنٹ باشندوں کے مماثل قرار دیا ہے جنہیں کیتھولک فرانس سے زبردستی نکال دیا گیا تھا اور انہوں نے برلن میں پناہ لے کر اپنے چرچ تعمیر کر لئے تھے۔ جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد ۳٫۶ ملین ہے۔ اس لحاظ سے اسلام، جرمنی میں ایک اہم قوت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بطور خاص اس لحاظ سے کہ ملک میں پہلے ہی ۲۰۰۰ (دو ہزار) مساجد یا دینی مراکز موجود ہیں۔ صرف کولون شہر میں ایک سو مساجد اور اسلامی مراکز قائم ہیں۔ کولون میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد ۷۰۰۰۰ (ستر ہزار ہے) سے زائد ہے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد جرمنی کے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ڈورٹمنڈ دوسرے نمبر پر ہے۔ روہر کے اس بڑے شہر کی تقریباً ۴۰ فیصد آبادی ترک مسلمانوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر میں علاقے کی فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے جرمنی آئے تھے۔ علاقے میں ترک مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔

ڈورٹمنڈ کی سب سے بڑی مسجد، شہر کے شمال میں کیل سٹراسے میں واقع ہے۔ سفید اور سبز رنگ کی اس عمارت میں پہلے پروٹسٹنٹ چرچ تھا۔ اس عمارت کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا رخ مکہ معظمہ کی جانب ہے۔ مسجد میں نمازیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ نمازیوں میں غالب تعداد نوجوانوں کی ہے۔ رمضان المبارک کے دوران تو مسجد کھچا کھچ بھری رہتی ہے۔ جمعہ کے اجتماعات میں بعض اوقات نمازیوں کی صفیں مسجد کے باہر سڑک تک پہنچ جاتی ہیں۔ فالک ماٹیرنٹ ایک سماجی کارکن ہیں جنہیں شہری انتظامیہ نے غیر ملکی نوجوانوں کو پیشہ ورانہ تربیت کی ذمہ داری سونپ رکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ سڑا سے مسجد میں فرزندان اسلام کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے جبکہ مسیحی چرچ خالی ہوتے جا رہے ہیں۔

جرمنی کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں کے بیشتر مسلمان بھی ترک اور سنی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ نماز، عربی زبان میں ادا کی جاتی ہے اس لئے مراکش، شام یا الجزائری مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مسلمان، عربی زبان اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ترک نوجوان جو اسلام کی اصل روح اپنانا چاہتے

ہیں۔ عربی سیکھ رہے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے خاص طور سے برلن میں جو ترکی کے باہر ترکوں کا سب سے بڑا شہر ہے، عربی سیکھنے والے نوجوانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

ڈور ٹمنڈ کی جامع مسجد کے امام صاحب کا تقرر ترک مملکت کرتی ہے۔ اس مسجد سمیت دیگر کئی مساجد کا انتظام، "دیتناب" یا "دیانت" یعنی ترک اسلامی دینی مرکز کے سپرد ہے جو انقرہ میں وزارت مذہبی امور کا ذیلی شعبہ ہے۔ جرمن حکام اس شعبے کو ترجیحاً پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ ترکی کے سیکولر رجحان کے حامل روایتی اسلام کا عکاس ہے جس میں مغربی معاشرتی اقدار اپنانے کی بہت گنجائش ہے۔(۱) لیکن یہ ڈور ٹمنڈ کے تیس اسلامی دینی مراکز میں واحد مرکز ہے جس کا نظم و نسق اس نہج پر چلایا جاتا ہے۔

جب کوئی فرد ایسی مسجد میں داخل ہوتا ہے جس کا انتظام دیانت کے کنٹرول میں نہ ہو تو باہر کے کسی فرد کے لئے فوری طور پر یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ عمارت محض عبادت گاہ ہے یا سماجی اور سیاسی اجتماعات کے لئے مرکز ہے۔

مساجد میں ترک اثرات بہت واضح ہیں۔ تقریباً ہر مسجد کے ساتھ فٹ بال کلب ہے جو ترکی کے پرچموں سے آراستہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ دیواروں پر تین ہلال والے قوم پرست عثمانی پرچم بھی لٹکے نظر آتے ہیں۔ مختلف مساجد کے منتظمین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے جن کا انتظام مختلف انجمنیں چلاتی ہیں چند برس سے یہ انجمنیں خود کو ترک حکام کے اثر و رسوخ سے آزاد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔(۲)

اسلام کے بارے میں ترکوں کے تمام مکاتب فکر، جرمنی میں موجود ہیں جہاں ان کے وسائل زیادہ ہیں اور انہیں اظہار رائے کی بھی ترکی سے زیادہ آزادی حاصل ہے لیکن اس کے باوجود سرکاری حکام، راسخ العقیدہ اور عسکری ذہن رکھنے والوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ کمال اتاترک کے نظریات کی مخالف جماعتوں میں ملی گوروس اسلامی گروپ سب سے نمایاں ہے اس گروپ کے نئے ترک وزیر اعظم جناب نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی سے قریبی رابطے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے سے جرمنی، ترکی کے اسلامی گروپوں کے لئے محفوظ ٹھکانے کی حیثیت رکھتا ہے جو ترکی میں اسلام کی از سر نو سربلندی کے لئے کام کر رہے ہیں۔

خود نجم الدین اربکان اپنے سیاسی کیریئر کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے برسوں جرمنی میں مقیم رہے اور آج قرآن مجید کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے والے ترکوں میں نمایاں تعداد جرمنی میں پیدا ہونے والی تیسری نسل کے ترک نوجوانوں کی ہے۔ بیلے فیلڈ یونیورسٹی کے ماہر عمرانیات ولہیلم بائٹ مئیر کے جائزے کے مطابق فرانس اور جرمنی دونوں ملکوں میں نوجوانوں میں اسلام کی طرف پلٹنے کا رجحان واضح طور پر بڑھ رہا ہے۔ بائٹ میئر کے بقول اسلام کی طرف لوٹنے والوں میں جرمنی میں جنم لینے والے ترکوں کا تناسب زیادہ ہے اور ان ترکوں کو اپنی مادری زبان ترکی سے زیادہ عبور جرمن زبان پر حاصل ہے۔ لیکن وہ جرمن باشندے نہیں بن سکتے کیونکہ جرمن قانون کی بنیاد "خون کا رشتہ" ہے۔ اگر کوئی ملی گوروس کے

لیڈروں کی تحریر و تقاریر پر یقین و ایمان رکھتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جرمنی، اشاعت و استحکام اسلام کے لئے کام کرنے کی بہترین جگہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمن معاشرہ حیرت انگیز طور پر رواداد ہے۔ بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا کہ علوم شرقیہ کی عالمی شہرت یافتہ ماہر ڈاکٹر اینی میری شمل نے آیات شیطانی نامی کتاب کی کھل کر مذمت کی تھی اور اسے ملحدانہ اور دشنام طرازی قرار دیا تھا۔ تاہم انہوں نے سلمان رشدی کی ہلاکت کے فتوے کو درست تسلیم نہیں کیا تھا۔ حال ہی میں جرمن فضائی کمپنی لفتھنزا نے اعلان کیا کہ رشدی کو اس کے طیاروں میں سفر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ فضائی کمپنی نے یہ اعلان اپنے مسافروں کو ممکنہ حملوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے کیا۔

فرانس کے بالکل برعکس جہاں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ فرانس میں اسلام کو فرانسیسی رنگ میں رنگا ہوا ہونا چاہیئے اور اسے دنیا داری کا مظہر ہونا چاہیئے جبکہ جرمنی میں لوگوں کو کسی کے عقائد پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مملکت اور مذہب ایک دوسرے سے واضح طور پر الگ نہیں ہیں وہاں دوسرے ممالک کے مقابلے میں اسلام زیادہ طاقتور ہو سکتا ہے۔

برلن میں سوشل سائنسز کے مارک بلوخ سینٹر کے اسلامی علوم کے اسکالر ریے لیویو کا کہنا ہے کہ جرمن معاشرے میں یہ غیر معمولی مذہبی رواداری آوگس برگ کے ۱۵۵۵ کے امن معاہدے کا نتیجہ ہے اس معاہدے کے تحت جرمنی کو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ حصوں پر مشتمل ملک قرار دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ ملک میں لوگوں کو اپنی پسند کے مذہب اور عقائد پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔

"اسلام اور گرجا گھر" نامی کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ جرمنوں کے لئے زیادہ تشویشناک بات اسلام کے بجائے الحاد اور لادینیت کا فروغ ہے کیونکہ جرمن آبادی میں اسلام کے پیروکاروں کا تناسب ۳ فیصد سے زیادہ نہیں ہے جبکہ بے دین لوگوں کا تناسب ۲۵ فیصد ہے۔ چرچ اور مملکت کے درمیان رشتوں کے بارے میں عام بحث و مباحثہ کا موضوع، اشاعت اسلام نہیں بلکہ فروغ لادینیت رہا ہے۔ صوبہ بادویریا کے تعلیمی اداروں کے کلاس رومز میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوب تصویر یا صلیب ساتھ لے جانے کا تنازعہ کارلس روئی کی آئینی عدالت کے فیصلے کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ کسی اسلامی سلطنت میں ایسے ماحول کا وجود ناقابل تصور ہے۔ علاوہ ازیں جرمنی میں نہ تو اسلام اور جنونیت کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کا دہشت گردی سے تعلق جوڑا جاتا ہے۔ الجزائر، جرمنوں کے لئے ویسے ہی بہت دور ہے۔ تشدد کے واقعات سے ترکوں کے تعلق کے بارے میں لوگوں کی عمومی رائے ہے کہ ترکوں اور کردوں کے تنازعے کا شاخسانہ ہے۔ جرمن سمجھتے ہیں کہ اس تنازعے میں مذہب کا کوئی تعلق اور کردار نہیں ہے حالانکہ برلن سے تعلق رکھنے والے ایک فرانسیسی اسکالر کے بقول جو کردوں کے مسائل سے گہری واقفیت رکھتے ہیں فریقین، اپنے اپنے موقف کے جواز کے طور پر اسلام کو استعمال کرتے ہیں۔ جرمنی میں مقیم ترکوں کے مخالف نسل پرست عناصر کی کارروائیوں کا سبب اسلام کی مخالفت نہیں بلکہ نسلی منافرت ہے۔ جرمنی میں صورت حال فرانس

کے برعکس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جرمنی میں مقیم بیشتر مسلمان، جرمنی کے بجائے اپنے آبائی وطن کو اپنی شناخت سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی اصل قومیت برقرار رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بیشتر چاہتے ہیں کہ بعد از وفات انہیں ترکی میں سپرد خاک کیا جائے۔ حالانکہ گذشتہ کئی برسوں سے جرمنی میں مسلمانوں کے الگ قبرستان وجود میں آ گئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جرمنی میں مسلم خواتین کے حجاب کے استعمال پر کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ جرمن معاشرہ روزمرہ زندگی میں حجاب سمیت اسلامی شعائر کو با آسانی برداشت کر لیتا ہے۔ ادھر ادھر کے چند ناقابل در گذر تنازعات مقامی سطح پر اور عموماً مسلمانوں کے حق میں طے ہو جاتے ہیں۔ عموماً اس قسم کے تنازعات جرمنوں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ وہ زیادہ تر ترکوں کے مابین ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اوائل میں برلن میں کمال اتاترک کے نظریات کی حامی ایک استانی نے حجاب پہننے والی ایک طالبہ کی شکایت جرمن حکام سے کی تھی۔ اس ترک طالبہ کا تعلق کمال اتاترک کے غیر اسلامی نظریات کے مخالف ایک دینی گھرانے سے تھا۔

ڈور ٹمنڈ مسجد کے اڑوس پڑوس کے رہائشی علاقے کے جرمن مکین اپنے مسلمان پڑوسیوں کی وجہ سے کسی تشویش میں مبتلا نہیں ہیں۔ جب کیل سڑاسے میں مسجد قائم کی گئی تو جرمنوں نے کوئی احتجاج کیا نہ ہی مسجد کے خلاف انتظامیہ کو درخواستیں دیں۔ البتہ کچھ عرصے بعد ایک گمنام شکایتی خط موصول ہوا تھا جس میں مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کسی شخص نے اس پہلو کی جانب توجہ دلائی تھی کہ مسجد کی عمارت میں پرچون کی ایک دکان ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ ایک قانون پسند شہری کی حیثیت سے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس دکان کا ٹریڈ ٹیکس ادا کیا گیا ہے یا نہیں؟

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ جرمن معاشرہ اسلام کے ساتھ شیر و شکر اور ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ڈور ٹمنڈ میں کسی خاص مشکل کے بغیر اسلامی مراکز قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن مقامی آبادی کی جانب سے مزاحمت کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔

باڈن وٹمبرگ جیسے واقعات کئی مرتبہ ہوئے ہیں اور مقامی حکام نے میناروں کی ایک حد سے زیادہ بلندی یا اذان کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر اعتراض کیا۔ ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں کہ پروٹسٹینٹ مذہبی پیشواؤں نے اس بنیاد پر احتجاج میں حصہ لیا کہ "مسلمانوں کا خدا، عیسائیوں کا خدا نہیں ہے۔

حکومت کی سطح پر رواداری اور نیک خواہشات موجود ہیں جن کے مطابق ایک طویل عرصے میں اسلام اور جرمنوں میں ہم آہنگی ممکن ہے۔ اگرچہ مملکت کے قوانین کے تحت تمام بڑے مذاہب کو کارپوریٹ حیثیت حاصل ہے اور قانون کے تحت وہ چاہیں تو پیروکاروں سے چرچ ٹیکس وصول کر سکتے ہیں اور ان مذاہب کو بہت سے سرکاری اداروں مثلاً ذرائع ابلاغ، ہسپتالوں اور فوج میں نمائندگی دی جا سکتی ہے لیکن جرمن حکام نے ابھی اسلام کی یہ حیثیت تسلیم نہیں کی ہے جو باعث حیرت ہے۔ کیونکہ کٹر اور قدامت

بقیہ ص ۳۶ پر